محمد خالد اختر کا ناول بیس سو گیارہ :فینٹسی کے عناصر

Elements of Fantasy in Muhammad Khalid Akhtar's Novel; 2011

[1] ڈاکٹر عبدالشکور

Abstract:

Muhammad Khalid Akhtar, an eminent man of letters of Urdu, has a writing style peculiar to himself. His writings are on wide ranging subjects. Though he has proved his mettle in many a genre of the Urdu literature, but satire and fiction are standout amongst them."2011" his famous novel was published in 1950.George Orwell's legendary "1984" inspired him to write this novel."2011" has the distinction of being the first complete fantasy novel of Urdu literature wherein a model of utopian state has been dealt which bears a close resemblance to what is modern day Pakistan. Novel projects the glimpses of future economy, politics, literature, science, education and journalism. This article offers analysis of fantasy elements in the novel

Keywords: Fantasy, Novel, Hero, Other world, Magical, Strange, Imagination, Historic

فینٹسی کسی بھی قصہ یا کہانی کا وہ عنصر ہے جو مافوق الفطرت اور حقیقت کے برعکس ہوتا ہے۔ یوں تو محمد خالد اختر کے افسانے ہوں یا ناول فینٹسی عناصر سے پرمایہ نظر آتے ہیں لیکن بیس سو گیارہ پر یہ پرچھائیاں زیادہ گہری ہیں۔ یہ ناول ۱۹۵۰ میں منصۂ شہود پر آیا لیکن اس میں مستقبل کی تصویریں دکھانے کی ناول نویس نے کوشش کی ہے۔ اس تصنیف میں ماضنین کی ایک خیالی ریاست کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے جو اہمیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ فینٹسی بھی ہے۔

کلیدی الفاظ: فینٹسی، ناول، خیالی ریاست، ہیرو، دوسری دنیا، جادو، تعجب، تحیر، مافوق الفطرت، تاریخی

فینٹسی (Fantasy) قصہ یا کہانی کا وہ عنصر ہے جو بے بنیاد، حقیقت کے برعکس، وہم پر مشتمل، دوسری دنیاؤں کے متعلق، عجیب و غریب، طلسماتی، مضحکہ خیز اور بے مہار تخیل کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں ناقابل یقین واقعات کی بہتات ہوتی ہے۔ فرشتے، دیوی، دیوتا، جن، بھوت، چڑیل، پریاں، جانور، پرندے، مشینیں، روبوٹ، صاحبِ کرامت ہستیاں، جادوگر اور فوق العام ہیرو بطور کردار شامل ہوتے ہیں۔ فینٹسی کے عناصر درج ذیل ہیں۔

۱۔ بولتے اور فکر و فرزانگی کا مظاہرہ کرتے حیوانات

[1] لیکچرار، شعبۂ اردو، ایف۔ جی پوسٹ گریجویٹ کالج، ایچ۔ ایٹ اسلام آباد

۲۔ بے قابو تاریخ یا زمانہ

۳۔ ہیروز اور مثالی انسانوں کے کارنامے

۴۔ پریوں کی کہانیوں میں موجودگی

۵۔ ایسے سائنسی موضوعات جو بعید از حقیقت ہوں

۶۔ اساطیر

۷۔ سحر

۸۔ دوسری دنیا کا منظر نامہ

۹۔ زمین کے علاوہ باقی سیاروں پر انسانی آبادی

۱۰۔ نرگسیت

۱۱۔ مثالیت پسندی

فینٹسی ایک ایسا عنصر ہے جو افسانوی ادب کی تمام اصناف میں پایا جاتا ہے لیکن داستان میں اس کی موجودگی زیادہ ہے۔ اردو داستان اور انگریزی ناول کے اثرات سے اردو ناول میں نہ صرف فینٹسی عناصر شامل ہوئے ہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی ہوتا رہا ہے۔

اردو ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے جن کے ناول سبق آموز اور دلچسپ ہونے کے علاوہ اپنے عہد کی مختلف سماجی، تہذیبی اور تاریخی حقیقتوں کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں فینٹسی عناصر کا وجود نہیں ہے۔ اردو ادب کے اولین ناول نویس کے بعد ادبی افق پر نمایاں ہونے والے دو اہم ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر ہیں۔ ان ناول نویسوں کے یہاں فینٹسی عناصر کی موجودگی نظر آتی ہے۔ فسانہء آزاد، جام سرشار، سیر کہسار، کامنی، خدائی فوجدار، پنڈت رتن ناتھ سرشار کے اہم ناول ہیں۔ سرشار کے ناولوں کی داستانوی فضا، مافوق الفطرت کردار اور تعجب انگیز واقعات فینٹسی عناصر ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں فردوس بریں، ماہ ملک، شوقین ملکہ، مقدس نازنین اور اسرار دربار حرام پور میں جادو، فوق العام ہیرو، حیوان،

 ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

جنات اور پریاں ایسے فینٹسی عناصر موجود ہیں۔ یہ عناصر انگریزی ناول اور اردو داستان کے توسط سے ان کے یہاں شامل ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا دو موخر الذکر ناول لکھنے والوں کے بعد محمد خالد اختر کے یہاں فینٹسی عناصر کے حامل ناول لکھنے کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔

محمد خالد اختر (۱۹۲۰ء۔ ۲۰۰۲ء) اردو ادب کے ایک صاحب اسلوب اور متنوع جہات کے حامل ادیب ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح، ناول، افسانے، سفر نامے، تحریف، خطوط، خاکے، ترجمے، اور تبصرے شامل ہیں۔ انہوں نے جس صنف میں قلم اٹھایا اپنی صلاحیتوں کو خلوص کے ساتھ برتا اور داد و تحسین بھی سمیٹی ہے۔

بیس سو گیارہ اردو ادب کے ممتاز مزاح نگار محمد خالد اختر کی پہلی تصنیف ہے۔ ناول پہلی بار ۱۹۵۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ ناول نویس نے فینٹسی انداز میں ایک خیالی ریاست ماضنین کو پیش کیا ہے۔ اس ریاست کی پیش کش سے ناول نگار نے سیاسی اور معاشرتی برائیوں پر طنز کی ہے۔ مصنف نے کتاب کے تعارف میں اسے مستقبل کے متعلق ایک فینٹسی قرار دیا ہے ا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس فینٹسی کے لکھنے کا خیال پہلے پہل انھیں تب آیا جب انھوں نے مشہور ناول نگار جارج آرویل (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۵۰ء) کے ناول نائنٹین ایٹی فور (۱۹۸۴ء) پر ریویو پڑھے۔[۲] جارج آرویل کا ناول بھی بیس سو گیارہ جیسا ہے۔ خالد اختر نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ ان کا ارادہ ایچ جی ویلز (۱۸۶۶ء-۱۹۴۶ء) کی فینٹسیوں کے تتبع میں لکھنے کا تھا۔ آرویل نے اس میں بیسویں صدی کے آخر کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی صورت حال کا امکانی اور تصوراتی نقشہ کھینچا ہے جب کہ محمد خالد اختر نے بیس سو گیارہ میں اکیسویں صدی کے آغاز کا نقشہ پیش کیا ہے۔

محققین اور ناقدین نے فینٹسی کے لیے جن امور کو ضروری سمجھا ہے وہ تمام اگر اردو ادب کے کسی ناول میں موجود ہیں تو وہ بیس سو گیارہ ہے۔

فینٹسی کسی ایسی تخیلاتی تحریر کو کہا جاتا ہے جس میں مصنف اپنے مشاہدے کے زور اور تخیل کی بلند پروازی کے ذریعے کبھی مستقبل کو حال میں کھینچ لاتا ہے اور پیش گوئی کے انداز میں مخصوص حالات و واقعات کو

ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، کبھی وہ عمرِ رفتہ کو آواز دے کر حال کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی کبھی ماضی و مستقبل دونوں کو حال میں یکجا کر کے ان کے تخیلاتی روابط اور تضادات سے قارئین کو محظوظ و متاثر کرتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ بالکل ہی خیالی انداز میں کسی انوکھی ریاست کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ فینٹسی کو مصنف کے خوابوں کی دنیا بھی قرار دیا جاتا ہے۔ مصنف کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ خوابوں کی اس دنیا کے ذریعے ہماری اصل دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح وہ گویا تخیل کا سہارا لے کر کسی بد عنوان معاشرے، حکومت یا مختلف معاشرتی ناہمواریوں کو نشانہء طنز بناتا ہے۔[۳]

تاریخ سرگزشت بنی آدم کا قصہ ہے۔ اس انگارہء خاکی نے کرہ ارض پر جو تغیر و تبدل رونما ہوتے دیکھے وہ سبھی تاریخ کا جزو ہیں۔ تاریخ کا بڑا موضوع انسان اور سماجیات ہیں۔ ان سے انسلاک رکھنے والے تمام علوم، نظریات اور افکار بھی تاریخ سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کا دامن سماج، مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب، اقتصادیات، فلسفہ اور سائنس کے ارتقاء کو بھی عیاں کرتا ہے۔ چوں کہ تاریخ کے قدم ہر اس شاہراہ، گھاٹی یا پگڈنڈی پر پڑتے ہیں جہاں پر انسانوں کے قدم ثبت ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے ادب سے بھی علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح انسان اور تاریخ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اسی طرح ادب اور انسان بھی یکجا ہیں۔ تاریخ اور ادب کا بڑا موضوع کیوں کہ بشر ہے اس لیے ان میں گہری وابستگی موجود ہے۔ ناول ادب کی واحد صنف ہے جس میں تخیلاتی عناصر کے باوجود حیاتِ انسان کی مفصل داستان دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لیے ناول کی ایک نوع تاریخ سے ہی پھوٹتی ہے اور اسے تاریخی ناول کہا جاتا ہے۔ اس اشتراک کی بابت ڈاکٹر ممتاز عمر تاریخ اور ناول کو مشترک چیز قرار دیتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''انسانی زندگی میں پیش آنے والے ایسے واقعات جن سے ان کی ابتدائی معاشرتی زندگی کی سیاسی سرگرمیاں کیسے رونما ہوئیں کو تخیل کے ساتھ قلم بند کیا جائے کیوں ناول نہ تو زندگی کی ہو بہو تصویر ہوتی ہے نہ محض تنقیدِ حیات و تجدید حیات۔ اس لیے تاریخ اور ناول کے موضوع کو مشترک کیا جا سکتا ہے۔''[۴]

تاریخی ناول کی کہانی زیادہ تر ماضی کے متعلق ہوتی ہے اور اس میں تخیل کی رنگ آمیزی بھی شامل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اس حوالے سے بڑی اہم بات کی ہے:

> ''تاریخی ناول نگار مواد تو تاریخ سے جمع کرتا ہے لیکن اس کے سامنے مسائل حال اور مستقبل کے ہوتے ہیں۔ وہ اس خوب صورتی سے ماضی کے واقعات کو سمیٹتا ہے کہ خود بخود حال اور مستقبل کی تصویر ذہن میں سجنے لگتی ہے۔''[۵]

تاریخی ناول میں شامل کیے گئے مواد اور اس کی پیش کش کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے تاریخی ناول کی درج ذیل چار اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ خالص تاریخی ناول

۲۔ ملے جلے تاریخی ناول

۳۔ خیالی ناول (جس میں تخیل کا عنصر زیادہ ہو)

۴۔ خالص خیالی ناول [۶]

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی پیش کردہ تاریخی ناول کی آخر الذکر دونوں اقسام کے عنوان سے ہی یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان میں تخیل، فسوں کاری اور مافوق الفطرت عناصر غالب ہیں۔ اس لیے راقم کی رائے میں ناول کی اس نوع کو تاریخی ناول نہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہو گا جب ناول میں بیان کیا گیا کوئی واقعہ خلاف عقل ہو، اس کے کردار مافوق الفطرت اور ناقابل تسخیر ہوں، جادوئی اور تخیلاتی عناصر کی آمیزش ہو تو یہ تاریخی فینٹسی کے حامل ناول کہلائیں گے۔

فینٹسی چوں کہ ناممکنات کی دنیا ہے، تحیر و تجسس کا جہاں ہے، اس لیے یہاں تاریخ بھی بے قابو ہے۔ بے قابو اس معنی میں کہ اس کا رخ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل دونوں طرف ہو سکتا ہے۔ اردو ادب میں دونوں طرز کے ناول موجود ہیں۔ عبدالحلیم شرر، ایم اسلم، نسیم حجازی، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر احسن فاروقی اور وحید احمد کے یہاں تاریخ کا سفر ماضی سے حال کی جانب ہے۔ احمد عقیل روبی کے ناول ساڑھے تین دن کی

زندگی میں تاریخ کا رخ حال سے ماضی اور ماضی سے حال اور مستقبل تینوں طرف گامزن نظر آتا ہے۔ جب کہ محمد خالد اختر کے یہاں بیس سو گیارہ میں تاریخ کا سفر مستقبل کی جانب ہے جو کہ تاریخی فینٹسی ہے۔ تاریخی فینٹسی کے علاوہ سائنس فینٹسی کے عناصر بیس سو گیارہ کی زینت ہیں۔

ادیب فکری طور پر ثروت مند ہوتا ہے۔ کسی بھی صنف کے تخلیق کار حقیقی دانش ور ہوتے ہیں۔ جو شخص واقعتاً دانش ور ہو وہ اپنے عہد سے بہت آگے سوچتا ہے۔ وہ اپنی چشم تصور سے قوم کے مستقبل کو دیکھنے اور بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس لیے ارسطو نے شاعر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ شاعر کا تفاعل یہ نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو بیان کرے جو واقع ہو چکی ہیں۔ دراصل اس کا تفاعل ان چیزوں کو بیان کرنا ہے جو واقع ہو سکتی ہیں۔[۷] بیس سو گیارہ محمد خالد اختر کی اسی فکری صلاحیت کی دلیل ہے۔ وہ آج سے قریباً ستر سال پہلے دور حاضر کا نقشہ کھینچتے ہیں جو کہ تاریخی یا زمانی فینٹسی ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء میں ملک و قوم کی جو صورت نمایاں کی آج ہمیں اپنے گرد و پیش میں وہ نظر آتی ہے۔ اب ہمیں نہ صرف وطن عزیز میں وہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی، تاریخی، سائنسی، اقتصادی، صحافتی، ادبی اور مذہبی حالات نظر آتے ہیں جو ان کی فکر سے ہم آہنگی رکھتے ہیں بلکہ وہ ایک وسیع فکری کائنات کے مالک تھے اسی لیے جغرافیائی حدبندیاں بھی ان کے خیالات کو نہ روک پائیں۔ باقی دنیا کا احوال بھی ان کی فکری تصویر جیسا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، افریقہ، عرب، ایران اور دیگر ہمسایہ ممالک پر ان کی رائے زنی بھی درست ثابت ہو رہی ہے۔

بیس سو گیارہ میں خالد اختر نے ناول کا آغاز چوتھی عالمی جنگ کی تباہ کاریوں سے کیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء میں دنیا کے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی رو سے ۱۹۹۲ء میں نائٹروجن بم کے استعمال سے امن عالم تہہ و بالا ہو جائے گا۔ اس بربادی کا آغاز شمالی امریکہ سے ہو گا اور بعد میں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، فرانس، اور برطانیہ بھی ایٹمی تباہ کاری کی زد میں آجائیں گے۔ مصنف کے مطابق یہ تباہ کاری اور ہولناکی اس قدر سرعت سے ہوئی ''چند گھنٹوں میں ہزاروں سال کی تہذیب کا روحانی سفر صفر ہو گیا۔''[۸]

تباہی کا مذکورہ ذکر تاریخی فینٹسی کے ذریعے ناول میں کیا گیا ہے۔اس کے عقب میں حساس آدمی کا وہ احساس چھپا ہے جو امن عالم کو تباہ ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن ملکوں اور افراد کے رویے امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں جن کا فکری عکس مصنف نے ناول میں مقید کرنے کی سعی کی ہے۔

بیس سو گیارہ میں مصنف نے ایک خیالی ریاست ماضنین کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ خیالی ریاستوں کا قیام ادباء اور اہل فکر میں پہلی دفعہ پیش نہیں کیا گیا۔ تاریخ میں پہلی بار افلاطون نے بھی ایک خیالی ریاست کا اپنی تصنیف ری پبلک میں نقشہ پیش کیا تھا۔ ماضنین ایک ایسی ریاست ہے جہاں ہاتھ ملانا غلط تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں ملتے وقت ناک سے ناک رگڑتے ہیں۔ ماضنین کا دستور ہے کہ ریاست اور اس کے باشندے مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف سفر کریں گے:

> ''اب جب کہ ساری دنیا میں ۲۰۱۶ء ہے، ماضنین میں ۱۸۱۰ء ہے اور ماضنینوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ماضی کی طرف بڑھنا یا پٹنا ممکن ہے۔''[۹]

یہاں ماضی کی طرف بڑھنے سے مراد دقیانوسی اور جاہلانہ سوچ ہے۔ ہم اپنی قوم کو مد نظر رکھیں تو واقعتاً ہم مستقبل کے تقاضوں کو فراموش کیے ہوئے اور آنکھیں موندے ماضی کی جانب رواں ہیں۔ ملکی اور ملی تقاضوں سے ناآشنا ہیں۔

مصنف نے بیان کیا ہے کہ ماضنین کا کل رقبہ ایک ہزار دو سو ساڑھے پچاس مربع میل ہے جو اس کے ہمسایہ ملک کے باشندوں (پہاڑی چوہوں) کے صلح یا جنگ کے موڑ پر بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ اگر ماضنین کو پاکستان مراد لیں تو ماضی کی دو بڑی جنگیں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں ہمسایہ ملک بھارت سے لڑی گئی ہیں۔ آخر الذکر جنگ کے نتیجے میں پاکستان کا ایک بڑا حصہ کٹ کر بنگلہ دیش بن جاتا ہے۔ کل آبادی ۲۰۲۰ء کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق دو لاکھ ہے۔ ماضنین کا دارالسلطنت شترابا ہے اور یہی بڑا شہر بھی ہے۔ ماضنین کی سرکاری زبان شیکسپیرین انگریزی ہے جس میں قدیم سنسکرت کے الفاظ کثرت سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ زبان اینگلو سنسکرتی رسم الخط میں لکھی ہوئی ماضنینی ہے۔ اردو یہاں کے متوسط طبقہ کی زبان ہے۔

ہمارے یہاں بھی انگریزی کی حاکمیت ہے۔ ہمارا مقتدر طبقہ بھی اردو سے لگاوٹ کو اپنی تحقیر خیال کرتا ہے۔ ان کی اردو عبارت یا گفتگو میں بھی انگریزی زیادہ اور اردو کم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آج کل موبائل اور انٹرنیٹ کی وجہ سے رومن اردو کا چلن فروغ پا رہا ہے جو اردو زبان کے حق میں نہیں ہے۔ اس میں بھی انگریزی الفاظ کی آمیزش ہے۔ جو مصنف کے نقطہء نظر کی وضاحت کرتی ہے۔

ناول جس دور کی تخلیق ہے وہ زمانہ موبائل اور انٹرنیٹ کا نہیں رہا ہے۔ کیوں کہ ان دنوں ان ایجادات سے عوام اس قدر آشنا نہیں رہے ہیں۔ اردو یا مقامی زبانوں میں انگریزی الفاظ کا سرایت کرنا ان اختراعات کے کثیر استعمال سے ہوا ہے۔ ناول نویس نے ۱۹۵۰ء میں زبان پر ہونے والے مستقبل کے اثرات کو بھی کامیابی سے ناول میں سمو دیا ہے جو کہ تاریخی فینٹسی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ریاست کو چلانے میں وہاں کے حکمرانوں کی تعلیم، محنت، اخلاص، ہمدردی، تدبر اور بے باکی اہم ہتھیار ہوا کرتے ہیں۔ جب حکمران ان اوصاف کے حامل ہوں تو وہ ملک اور قوم کی تقدیر بدلنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھتے۔ بصورت دیگر ملک اور قوم امن و آشتی، تعمیر و ترقی، عزت و ناموس کے لیے ترس جاتے ہیں۔ پھر پس ماندگی، جہالت، بے روزگاری اور ناانصافی معمول کی چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ ایسے ممالک کے سربراہ جہالت کی علامت ہوتے ہیں۔ اسی لیے خالد اختر کی بیس سو گیارہ میں ریاست کے دو ایسے سپوت بھی ہیں جن کے یہاں جھوٹ اور جہالت کی وزارتوں کے قلمدان ہیں۔ ان اہم وزراء کے اوصاف سے کم لوگ آگاہ ہیں۔ اگرچہ ماضنین کے بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں، حکمران حلقوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ وزیر جھوٹ کی دونوں آنکھیں پتھر کی ہیں۔ وہ اندھا ہے۔[۱۰]

ترقی پذیر ممالک کی پسماندگی اور مسائل کا ایک بڑا سبب وہاں کے حکمران ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کسی بھی شعبہ کا وزیر ہو، وہ اپنے محکمہ سے متعلقہ امور کا ماہر ہوتا ہے۔ ان ممالک میں وزارت اہلیت پر ملتی ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کی بہت سی ترقی پذیر ریاستوں میں وزارتیں نااہل، جاہل، مالی طور پر مضبوط یا خوشامدی لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ یہی صورت حال ماضنین کی ریاست میں

درپیش ہے جہاں وزیر تعلیم بقول خالد اختر ایک تعلیم یافتہ جاہل ہے۔ اس نے اپنے ملک کی جامعات میں علم کے ایسے چراغ روشن کروائے ہیں کہ وہاں پڑھنے والے اب ان کی روشنی سے خیرہ ہو چکے ہیں۔ مصنف کے مطابق:

> ''یونی ورسٹیوں کا سلیبس بے حد سادہ اور ٹو دی پوائنٹ کر دیا گیا ہے اور ایک آدمی خواہ ساری عمر ہی تعلیم میں صرف کر دے، وہ جاہل رہتا ہے۔''[۱۱]

اپنے ملک کے حالات کو مد نظر رکھا جائے تو ہمارے یہاں بھی تعلیمی اداروں میں پڑھایا جانے والا نصاب کوئی مفید شہری اور تخلیقی ذہن پیدا نہیں کر پارہا۔ ہمارا نظام تعلیم افراد میں وہ خوبیاں پیدا نہیں کر پارہا جس سے کوئی بڑا ذہن یا ایجادات واختراعات کرنے والا دماغ پیدا ہو سکے۔ غلام ذہن، مفلوج دماغ اور فکری بونے پیدا ہو رہے ہیں۔ وطن عزیز کا تعلیمی نسق قومی حالات، تہذیب و معاشرت اور ضروریات سے میل نہیں کھاتا جس سے ترقی یافتہ اذہان کے پیدا ہونے کی امید ایک سراب ہے۔ وقت کے سفر سے ہمارا نظام تعلیم ابتر ہوتا رہا ہے۔ اس خرابی پر جہاں مصنف نے طنز کی ہے وہیں اس کا کئی دہائیاں قبل ادراک تاریخی فینٹسی ہے۔

ماضنین کے وزیر تعلیم کا خیال ہے کہ پچھلی دنیا کی سب بیماریوں اور مصیبتوں کی جڑ تعلیم پر زور تھا اور تعلیم بھی ایسی جو زندگی کو اور زیادہ الجھا ہوا اور دقیق بنا دے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تدریجاً ایک وسیع جہالت کی طرف لایا جائے۔ ہمارا آخری مقصد مکمل جہالت ہے۔[۱۲]

ملک کے تمام شعبوں میں ترقی و تنزلی کا دارومدار تعلیمی پالیسی پر ہوتا ہے۔ یہاں وزیر تعلیم کے خیالات حصول علم کی بابت گزر چکے ہیں، اس طرح کے ہوں، وہاں ریاستیں ہمیشہ کھوکھلی ہوتی ہیں۔ ایسی ریاستوں کے تمام شعبے ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ ماضنین کی صنعتی ترقی کو ہی دیکھ لیتے ہیں۔ ناول نویس کے مطابق:

> ''ماضنین میں صنعتی ترقی زوروں پر ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں آٹا پینے کی پانچ چکیاں اور تین گھاس کاٹنے کی مشینیں درآمد کی جا چکی ہیں۔ جس سے انسانوں اور حیوانوں کی خوراک کے مسئلے کا حل زیادہ نزدیک ہو گیا ہے۔''[۱۳]

ناول نگار نے فینٹسی کے سہارے صنعت کی زبوں حالی کا جو احوال بیان کیا ہے اس سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا نظام تعلیم ایسے افراد پیدا نہیں کر سکا جو ملکی اور معاشرتی ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں۔ ہم آج بھی اپنی صنعتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے امریکہ، چین، جاپان اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ پہلے سے موجود ادارے بھی ہم نے اپنی جہالت اور ناقص حکمت عملی کے باعث تباہ کر دیے ہیں۔ اس غفلت کی سزا میں کئی دہائیاں برباد ہونے کے اندیشے کو رد نہیں کیا جا سکتا ہے۔

محمد خالد اختر کی کاٹ دار طنز سے اہل معبد بھی نہیں بچ سکے ہیں۔ مذہبی طبقے کی منافقت اور عیاری کو بھی انہوں نے عیاں کیا ہے۔ لوگ ان کی عبادت و ریاضت اور ظاہر سے متاثر ہو کر ان کو پارسا سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے معبود کے سامنے جھکتے ہیں یا اس کی پوجا کرتے ہیں تو ان کا مقصد خالد اختر نے یوں بیان کیا ہے:

> ''مینیسٹو تو اتنا اچھا ہے، مینیسٹو تو اتنا نیک ہے، مینیسٹو میں اپنے قہر و غضب سے بچا، تو ماضنین کا مالک ہے۔ تو نے ہم کو ہاتھ دیے ہیں تاکہ ہم اپنے ہمسائے سے وہ چیز چھین سکیں۔ جن کی ہ میں ضرورت ہے، تو نے ہ میں منہ دیے ہیں تاکہ ہم باتوں باتوں میں ہم دوسروں کو چکمہ دے سکیں اور الو بنا سکیں۔'' [۱۴]

ستر سال پہلے کا خواب یا تصور آج کی مذہبی صورت حال پر بھی بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ اس فینٹسی ناول میں مذہبی پیشواؤں کا جو خاکہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی تھی وہ آج سچ کے بہت حد تک قریب ہے۔ پس ماندہ قوموں کا سوچنے کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کو اہمیت دیتے ہیں۔ چیزوں کے باطن میں جھانکنے کو شجر ممنوعہ خیال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے سبھی میدان زوال کی گرد سے اٹے ہوتے ہیں۔ تعلیم، معیشت، تہذیب، تاریخ اور مذہب سب میں فرسودہ اور لایعنی تصورات اور خیالات اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہر شعبہ زندگی اپنی اصل سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ جب ایسی صورت حال ہو تو پھر آسمانی کتب سے بھی لوگ وہ دانائی نہیں سمیٹ سکتے جو انہیں بتائی جاتی ہے۔

مذہبی اجارہ کے بعد ناول نویس نے ناجائز سیاسی تصرف کو موضوع بنایا ہے۔ خالد اختر کی تخیلاتی ریاست ماضنین کے حکمران عوام کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ اس ملک کے لوگ بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔ عوام کی ذہنی و تعلیمی پس ماندگی اہل حکومت کے لیے مفید ہے اور اسی وجہ سے اقتدار کی مسندوں پر ان کا قبضہ وسعت اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ حکمران یہاں صرف حکومت کرنے کے لیے موجود ہیں اور بلند و بالا دعوؤں سے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ ان کے مال و زر جائیداد سب باہر ہیں۔ یہاں وہ صرف آقا ہیں۔ آج اگر ہم اپنے سیاسی نظام پر نگاہ دوڑائیں تو وہ اس سے چنداں مختلف نہیں جسے محمد خالد اختر نے کئی دہائیوں قبل دیکھا ہے۔ ایک صاحب اقتدار کے الفاظ اس طبقہ کی مکمل حقیقت حال بیان کرتے ہیں:

> ''ہمارا سب سے طاقت ور جذبہ۔۔۔۔۔ جنسی خواہش سے بھی زیادہ طاقت ور۔۔۔ طاقت اور شہرت کی خواہش ہے، دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے اور ان کو ادھر ادھر آرڈر اباؤٹ کرنے کی خواہش۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہم ان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان کو ہمیشہ یہ بتاتے ہیں کہ ہم ان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ جاہل ہیں مگر ہم ان کی جہالت کو اور زیادہ گہرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ یہ ہمارے حق میں مفید ہے۔''[۱۵]

سیاست کے علاوہ ادبیات بھی بیس سو گیارہ کا اہم موضوع ہے۔ اشفاق احمد ورک نے خالد اختر کے نظریے کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنے زاویۂ نظر کے حساب سے ہر جگہ ادب برائے زندگی کے قائل نظر آتے ہیں اور ان کے خیال میں وہ ادب کس کام کا جس میں زندگی کی تب و تاب نہ نہیں ہے۱۶۔ ادب برائے زندگی کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ خالد اختر طبعاً رومان پسند ہیں اور یہ رومانیت ان کی تخلیقات میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ بیس سو گیارہ میں بھی ان کا رومانوی انداز نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ عالمی جنگ جس میں بہت سے انسان لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور کئی تہذیبیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہیں لیکن خالد اختر کو سب سے زیادہ افسوس فرانس کی بربادی کا ہوتا ہے کیوں کہ فرانس کی تہذیب و ثقافت اور آرٹ دنیا بھر میں منفرد

ہیں۔ سب سے بڑھ کر عورت ان کی زندگی کا مرکزہ ہے ۱۷۔ صنف نازک کے متعلق اہل فرانس کی سوچ کو خالد اختر نے یوں بیان کیا ہے۔

خالد اختر کی فکر میں ارتقا ہے۔ وہ انتہا پسندی سے دور بھاگتے ہیں۔ ساری زندگی کسی ایک ہی فکر کے اسیر بن کر نہ رہے۔ ان کے خیالات و نظریات میں تبدیلی اور تنوع ظاہر کرتا ہے کہ وہ وسیع النظر ادیب ہیں۔

مارکسی یا ترقی پسند تحریک کا نظریہ ہے کہ دنیا میں سب برائیوں کی جڑ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ اگر انسان کی معیشت مستحکم ہو تو اس کے لیے دنیا بہشت ہے۔ بصورت دیگر جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ماہ و سال رنج والم کے لا متناہی سلسلے بن جاتے ہیں۔ لیکن خالد اختر کے نزدیک انسان کے روٹی کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں۔

میرا ذاتی اعتقاد یہ ہے کہ ہ میں اپنی زندگی میں روحانیت اور اعلیٰ اقدار کو زیادہ سے زیادہ لانا چاہیے۔ آدمی صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ آدمی روٹی سے زندہ ہی نہیں رہتا۔ ۱۸ ہمارے یہاں مارکسی تحریک سے وابستہ دانش ور دنیا کی ہر بیماری کا علاج دو وقت کی روٹی میں دیکھتے ہیں۔ ان کا یہ طرز عمل کسی بھی معاشرے کے لیے کلی حقیقت کا نہیں ہو سکتا۔ آدمی کا دکھ محض روٹی نہیں ہے۔ اگر صرف بھوک کو بھی مد نظر رکھا جائے تو علم اور روحانیت بھی اسی کا حصہ ہیں۔ جو افراد ان امراض میں مبتلا ہیں وہ صرف نان شبینہ سے راحت نہیں پا سکتے۔ علمی اور روحانی بھوک کے علاوہ نفسیاتی عوارض بھی سلگتے مسائل ہیں۔ ان الم ناک مسائل کا تدارک کیے بغیر بھی صحت مند انسان کا تصور محال ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خالد اختر کے مزاج میں رومانویت گندھی ہوئی تھی لیکن وہ اس تحریک سے وابستہ ادباء یا اس مزاج کے حامل لکھاریوں کی خامیوں پر بھی طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ وہ ہمہ قسمی انتہا پسندی کے مخالف نظر آتے ہیں اس کا ثبوت ان کی رومانوی تحریک سے متعلق رائے بھی ہے:

> ''موجودہ ادب کی ابتداء اس لیے ہوئی کہ ماضیین میں عورتیں تھیں۔۔۔۔ بعض عورتیں جن کی وہ اپنے کوچے میں کبھی جھلک دیکھ پاتے تھے، ان کو بالکل دیوانہ اور گرویدہ کر دیتیں

اور کئی کئی راتیں وہ یہ سوچتے رہتے کہ اگر وہ ان کو حاصل کر لیں تو وہ ان کے ساتھ کیا کیا حرکتیں کریں اور کیسے کیسے اپنے ارمان پورے کریں۔۔۔۔اس لیے انہوں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے ان افسانوں میں وہ بلا دھڑک وہ سب باتیں لکھنے لگے جن کو عملی طور پر کرنے کے لیے نہ ان کے پاس مواقع تھے اور نہ ہمت۔''[۱۹]

محمد خالد اختر کے یہاں باقی موضوعات کے علاوہ عہد موجود کے ادبی تناظر کی بھی دلچسپ اور حقیقت پسندانہ جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ان کی مذکورہ بالا آراء لحہ موجود کی بے جوڑ طرف داریوں کی رو سے درست ہے۔آج کے رومانوی ادبا سے متعلق ان کی آراء بھی حقیقت کے قریب ہیں۔

خالد اختر انسانی نفسیات کے بہت بڑے شناسا ہیں ادب اور نفسیات کا انسلاک بے حد مضبوط ہے اور بیس سو گیارہ میں انسانی نفسیات کی عکاسی بہت سے صفحات پر موجود ہے۔خالد اختر نے انسانی نفسیات کی عکاسی نہایت خوبصورتی سے کی ہے تاہم وہ طبقہ ءنسواں کی درست نفسیات سامنے نہیں لاتے۔جس انداز سے خالد اختر نے عورتوں کی نفسیات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جزوی طور پر تو درست ہو سکتی ہے تاہم مجموعی اعتبار سے خواتین ان کی رائے سے مختلف ہیں۔خالد اختر عورتوں سے متعلق لکھتے ہیں کہ :

''وہ اتنی خالی الذہن اور احمق ہوتی ہیں کہ ان کے جیتنے کے لیے اونچی فلاسفی، ادبی ذوق یا شاندار گفتگو اور یوسفانہ نقوش کوئی کام نہیں دیتے۔ان کی کسی مرد کی پسند عموماً مونچھیں تھپکنے یا اسی قسم کی کسی اور بے ہودہ سی عادت پر منحصر ہوتی ہے۔''[۲۰]

صنف نازک کے متعلق محمد خالد اختر کی ایک اور رائے ملاحظہ ہو:

''میرے دائیں بائیں بڑے کابو اور چھوٹے کابو کی بیویاں تھیں۔وہ دو طاقتور اور بڑے پیمانے پر بنی سنوری ہوئی عورتیں۔۔۔۔اور تم سمجھ سکتے ہو کہ شروع سے ہی میں کتنا سہا ہوا ہوں گا۔''[۲۱]

عورتوں کے متعلق محمد خالد اختر کی منفی رائے کے پس منظر میں ان کی گھریلو زندگی کے مسائل کارفرما ہیں۔ان کے اپنی بیوی سے تمام عمر تعلقات اچھے نہ رہے۔جس کا ثبوت ان کے خطوط اور ان کے

دوستوں کی آراء سے بھی ملتا ہے۔ دورِ حاضر کے ممتاز سفر نامہ نویس اور معروف ناول نگار مستنصر حسین تارڑ کے خالد اختر سے گہرے تعلقات رہے۔ وہ ان کی خانگی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جہاں وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ شریک ہوتے، وہاں بیوی کی موجودگی میں خائف سے بیٹھے رہتے۔ میں نے محسوس کیا کہ خالد صاحب کی بیگم کی گفتگو میں کچھ ہیجان آمیز خلل اندازی کا شائبہ ہے۔ خالد صاحب ان کی موجودگی میں چپ بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ سگریٹ سلگانے کی کوشش بھی نہ کرتے۔ لگتا تھا ان کے گھریلو تعلقات کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔[۲۲]

مسلمان قوم کے متعلق خالد اختر کے نظریات اس ناول میں بڑے روشن ہیں۔ وہ امت مسلمہ کے عالمی اتحاد کے حوالے سے خاصے مطمئن ہیں۔ مسلم دنیا کو وہ ''اسلامستان'' کہتے ہیں۔ جدہ کو مستقبل کا نیویارک کہتے ہیں اور انہیں امید ہے کہ مسلمان دنیا کی امامت کریں گے:

> ''دنیا میں لیڈر اس وقت جو ملک ہے وہ اسلامستان ہے۔ پاکستان، ایران اور افغانستان کا یہ ٹھوس بلاک جس کی سرکاری زبان فارسی ہے اور جس کا فیڈرل دارالحکومت کراچی ہے۔ اس ملک کا سربراہ خلیفہ کہلاتا ہے۔ دنیا بھر کی اعلیٰ ثقافت اور جمہوری اقدار اس ملک میں موجود ہیں۔''[۲۳]

ان کا یہ خیال فی زمانہ فینٹسی ہی نظر آتا ہے۔ لمحہ موجود میں بھی دیکھا جائے تو کچھ مسلمان ممالک آپس میں دست و گریباں ہیں۔ شام، عراق، لیبیا، افغانستان اور یمن داخلی انتشار کے باعث ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ جب انہیں اس قدر شدید عوارض کا سامنا ہے تو ان کے لیے دوسروں کی قیادت کا سوچنا خلاف حقیقت ہے۔

محمد خالد اختر کے فینٹسی ناول میں خیالی اور تصوراتی ریاست کا نقشہ تو پیش کیا ہی گیا ہے اس میں بہت سی باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ پاکستان کے مستقبل کی بھی فینٹسی ہے جو انہوں نے پیش کی ہے۔ خاص طور پر یہ کہنا کہ اس ملک کا دارالحکومت کراچی ہے اور اس کا نام اسلامستان ہے واضح کرتا ہے کہ انہوں نے بہت سی باتیں

جو فینٹسی کے سہارے پیش کی ہیں وہ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کے متعلق ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ملک کا جائے اقتدار کراچی تھا اور اسے بھی پھر اسلام کے نام سے جڑے شہر میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

اس ملک کے باشندے اپنی قومیت پر فخر کرتے ہیں۔ اس کی جمہوریت قابل رشک ہے قابل رشک صرف ان چند خاندانوں کے لیے ہے جو اقتدار پر قابض ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں صنعتی ترقی زوروں پر ہے اور مصنوعات باہر جاتی ہیں۔ اسلامستان کی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار ''شترابا'' ہے۔ ''شترابا'' کی سب مشینیں، مثلاً بجلی کی موٹریں، آٹا پیسنے کی چکیاں، ڈیزل انجن وغیرہ، اور سنڈری سامان، مثلاً کنگھیاں، بلیڈ، صابن اور عام استعمال کی بیشتر اشیاء سرخ چین یا اسلامستان سے درآمد کی جاتی ہیں۔ مشینوں کو چینی یا اسلامستانی انجینئر خود ہی آکر فٹ کرتے ہیں۔

اب اگر ہم اپنے ملک کے صنعتی نظام پر نگاہ دوڑائیں تو مذکورہ صورت حال سے انکار ممکن نہیں۔ کچھ صنعتیں پھلنے پھولنے کے قریب پہنچنے لگیں تو ہمارے ناقص بندوبست سے وہ بھی ویرانی کا شکار ہو گئیں۔ جہاں تک ہماری صنعت کی دیکھ بھال کا سوال ہے تو مصنف نے اس کی ذمہ داری کے حوالے سے پڑوسی ملک چین کا ذکر کیا ہے۔ آج اگر ہم اپنے حالات غور کریں تو ہمارے تجارتی اور اقتصادی تعلقات چین سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چائنہ پاکستان اقتصادی راہداری اس کا بڑا ثبوت ہے۔ لیکن یہاں اس صورت حال پر بھی ہمیں ناول نویس کو مستقبل بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔

عورت اور مرد کا ساتھ تخلیق آدم کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت بھی ہر دور میں یکساں رہی ہے۔ اس رشتے کی اہمیت مستقبل میں بھی اہمیت سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس نام نہاد تہذیب یافتہ دور میں بھی بنت حوا کی حالت ہر جگہ قابل رحم اور دگرگوں ہے۔ دور حاضر میں دنیا کے اکثر ممالک میں خواتین اپنے حقوق اور حیثیت کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ مغرب میں عورت کو بظاہر تو آزادی اور حقوق مل چکے ہیں لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو عورت کا حقیقی مقام و مرتبہ اہل مغرب ابھی تک سمجھ ہی نہیں سکے ہیں۔ ان کے یہاں عورت کے ناتواں کندھوں پر بچوں کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ روزی روٹی کا بوجھ بھی

آن پڑا ہے۔ یورپ میں عورت کی نام نہاد آزادی کسی طور پر بھی عورت کے حق میں سود مند نہیں ہے۔ اس کے برعکس مشرق میں ''ثناخوان تقدیس مشرق'' ابھی تک عورت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں بھی اخلاص سے عاری نظر آتے ہیں۔ آئے روز بنت حوا پر ظلم و بربریت کی نئی داستانیں تاریخ کا حصہ بنتی ہیں۔ محمد خالد اختر نے مغرب اور مشرق میں عورت کے تمام روپ اور جلوے دیکھے ہیں۔ ماضنین میں صنف نازک کی حالت ان کے زندگی بھر کے تجربات کی عکاسی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماضنین میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ عورتیں اس ملک میں صرف مردوں کے استعمال کی چیزیں ہیں اور تم ان کو اس طرح استعمال کرتے ہو جیسے اپنے ٹوتھ برش، گرم پانی کی بوتل اور اپنا کے سامان کو۔ آنے والے دستور کے دیباچے کا پہلا رکن بھی یہی کہتا ہے: ''سب آدمی برابر ہیں۔'' یہ جان بوجھ کر عورتوں کا ذکر نہیں کرتا۔ ماضنینی یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ عورتیں مردوں کے برابر ہو سکتی ہیں۔[۲۴] ماضنینیوں کے نزدیک عورت کا دوسرا نام گناہ کی ترغیب ہے۔ گناہ سے مراد اس ملک میں ہمیشہ جنسی فعل کی خواہش یا اس کے ارتکاب سے لی جاتی ہے۔[۲۵]

ماضنین کی ادبی گروہ بندی بھی بیس سو گیارہ میں خالد اختر کا اہم موضوع ہے۔ خالد اختر ادب میں تفرقہ بازی کے قائل نہیں ہیں۔ ماضنین کی ادبی گروہ بندی کے پردے میں محسوس ہوتا ہے کہ ناول نویس نے وطن عزیز میں موجود ادیبوں کی دھڑے بندی پر طنز کیا ہے۔ ہمارے یہاں ادباء نے علاقائی حد بندیوں اور معمولی سے فکری اختلاف کو بنیاد بنا کر دبستان بنائے ہیں۔ ان مختلف ادبی مسالک کی موجودگی میں جہاں غیر معیاری ادب تخلیق ہوتا ہے وہیں تنقید کا معیار بھی پست ہو جاتا ہے۔ ادیب ایک دوسرے کے متعلق بددیانتی پر مبنی آراء کو ادب کا حصہ بنا کر غلط فکر کی ترویج کرتے ہیں۔ ان کے جھگڑے اور الزامات کی سرگوشیاں شور شرابے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ماضنین میں اسی طرح کی کیفیت کے متعلق خالد اختر رقم طراز ہیں کہ ان اسکولوں کے مصنفوں کی چیخ چیٹ اور آپس کی تو تو میں میں یہاں کہ ادبی سین کا ایک بہترین تفریحی واقعہ ہے اور مقابلہ کرنے والے پٹھوں کی تکنیک دن بدن نکھر رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ مصنف گروپوں میں کام کرتے ہیں۔ عموماً تین تین چار چار مصنف مل کر رسالہ نکالتے ہیں۔ جس میں سب افسانے، آرٹیکل، خاکے ان کے اپنے

ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے آرٹیکل لکھتے ہیں، ایک دوسرے کی کتابوں پر ریویو لکھتے ہیں، ایک دوسرے کا انٹرویو لکھتے ہیں، اور یہ سب کچھ بے حد دلچسپ ہوتا ہے۔ اگر تم بہترین افسانہ نگار، باغی ترین شاعر، زبردست تنقید نگار بننا چاہتے ہو تو ان گروپوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونا پڑے گا۔[۲۶]

ادبی گروہ بندی کے سبب مذکورہ ماحول ادب کے لیے ہرگز سازگار نہیں ہو سکتا۔ اس عداوت کے نتیجے میں اب معیار کو نہیں مقدار کو پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ ادبی رسائل اور جرائد میں سفارش کی بنیاد پر فن پاروں کو جگہ ملتی ہے۔ اس ماحول کی بات محمد خالد اختر نے بیسویں صدی کے نصف میں کی تھی آج ہ میں ہر طرف اسی کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

محمد خالد اختر نے جہاں ادب میں گروہ بندی کی بات کی تھی وہیں اس کے دیگر مسائل پر بھی بات کی تھی جو آج سچ ثابت ہو رہی ہے۔ اردو ادب کے ادیب ان میں بھی بالخصوص دور حاضر کے لکھاری، زندگی کے تجربات سے زیادہ آگاہ نہیں ہیں۔ انہوں نے انسان اور کائنات کا گہرائی سے مشاہدہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگارشات میں تجربات، مشاہدات اور موضوعات میں تنوع نظر نہیں آتا۔ ان کا زاویہء نظر محدود ہے۔ ایسے ادباء کی تخلیقات کے متعلق محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

> ''یہ ہے نیا ادب۔ ان کے افسانے پڑھ کر کم از کم یہ فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا گروپ کہاں بیٹھ کر افسانے لکھتا ہے۔ ایک پیکارڈ کا گروپ ہے جو اپنے افسانے پیکارڈ میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔ ایک گروپ افسانے ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ پر بیٹھ کر سنہری نب کے فونٹین پن سے لکھتا ہے۔ دو تین گروپ گندم، باجرے، گنے، شلغم وغیرہ کے کھیتوں میں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں سے مختلف اناجوں اور سبزیوں کی خوشبو سونگھی جا سکتی ہے۔ ایک اور گروپ ہے جو ''غسل خانہ گروپ'' کہلاتا ہے۔ ان کے افسانے صابن اور بعض دوسری چیزوں کی باس دیتے ہیں۔''[۲۷]

ادب کے بعد خالد اختر کے یہاں بیس سو گیارہ میں صحافت بھی اہم موضوع ہے۔ صحافت عوام کے دکھ درد کو اخلاص کے ساتھ منظر عام پر لانے کا نام ہے تاکہ دکھی لوگوں کے مسائل حل ہوں اور ان کی آواز

مقتدر طبقہ تک پہنچے۔ انسان سکھ کا سانس لیں اور ان کے نبیادی حقوق پر کوئی ڈاکہ نہ ڈال سکے۔ ماضنین میں صحافت کا وہ طرز رائج ہے جس سے ملک میں اندھیروں کا راج مستحکم ہوتا ہے۔ ابن آدم کی مشکلات اور کرب کی صدائیں نہیں سنی جا سکتیں۔

بیس سو گیارہ میں ''شتر اباٹائمز'' زرد صحافت کی علامت ہے۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا اس اخبار کے لیے معمولی سی بات ہے۔ دورِ حاضر میں اگر میڈیا کے کردار کو دیکھا جائے تو تقریباً شتر اباٹائمز سے مماثلت نظر آتی ہے۔ صحافت اب عبادت نہیں رہی اور نہ ہی اس کا مقصد مظلوم کی دادرسی ہے۔ آج کل جہاں میڈیا مال وزر کمانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے، وہیں اس سے بڑھ کر پروپیگنڈا مہم بھی کوئی نہیں چلا سکتا۔ عالمی طاقتیں کسی بھی ملک پر قبضہ جمانے کے لیے دیگر وسائل کے ساتھ ساتھ اخبارات، رسائل اور ٹیلی ویژن کو بھی اپنا ہم نوا بناتی ہیں۔ اس کی واضح نظیر عراق پر ہونے والے امریکی حملے سے قبل جارج ڈبلیو بش کا وہ بیان ہے جو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے نشر کیا۔ اس بیان میں وہ برملا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری جنگ تمام محاذوں پر لڑی جائے گی جس میں میڈیا بھی شامل ہوگا۔ ان کی اس تقریر سے ذرائع ابلاغ کی صداقت اور غیر جانب داری کی تصویر نظر آتی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ پر آج بھی مشرق اور بالخصوص مسلمان ممالک شاکی ہیں اور اس میں وہ بڑی حد تک سچ پر ہیں۔ مشرق اور مسلم دنیا کا چہرہ عہد حاضر کا مغربی میڈیا اسی طرح دکھا رہا ہے جیسے ماضی میں مستشرقین نے دکھایا ہے۔ ذرائع ابلاغ کسی بھی شخصیت کو نمایاں یا طاقت ور بنا سکتے ہیں۔ خالد اختر کی پیش کردہ ریاست میں اسی لیے وزیر جھوٹ کی قوت میں بھی زرد صحافت کا کردار نمایاں ہے۔ مگر وزیر جھوٹ وہ بے پناہ اور خوفناک طاقت کبھی حاصل نہ کر سکتا جو اس کو حاصل ہے۔ اگر اسے ''شتر اباٹائمز'' کے ایڈیٹر مسٹر ایل ایف پٹاخا کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ ایل ایف پٹاخا، جاننے والے حلقے جانتے ہیں، اس مملکت میں سب سے زیادہ بارسوخ شخصیت ہے۔ وہ تخت کے پیچھے اصل ڈوری کھینچنے والا ہے۔ وہ ''شتر اباٹائمز'' کا ایڈیٹر ہونے کے علاوہ حکومت کا آفیشل چیف ناصح بھی ہے اور کابینہ کی آئندہ پالیسی، سفیروں کی تعیناتی وغیرہ پر اس کے مشورے ہمیشہ بلا چون وچرا قبول کر لیے جاتے ہیں۔[۲۸]

ذرائع ابلاغ کا اصل منصب عوام کے اذہان میں فکری قندیلوں کو روشن کرنا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے یہاں میڈیا ذاتی سوچ کو لاگو کرنے اور اسے نشر کرنے کے متعلق سر گرم رہتا ہے۔ یہاں ملکی اور قومی مفادات کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ صحافی، اخبار، رسائل اور چینل شب و روز دروغ گوئی، منافقت، منافرت اور سیاسی، سماجی، مذہبی حقائق کو مسخ کرنے کا اعادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ محمد خالد اختر کی تصوراتی ریاست کا نقشہ جو وہ ۱۹۵۰ء میں پیش کر چکے تھے آج وہ میں بہت سے میدانوں بشمول صحافت میں پورا ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

''شترابا ٹائمز'' کے علاوہ ماضنین میں دوسرا کوئی شخص روزانہ اخبار نکال سکنے کا مجاز نہیں۔ کیوں کہ ایل ایف پٹاخا جو کہ اس روزنامے کا مدیر ہے بے حد بار سوخ شخص ہے۔ وہ حکومت کے چیف ناصح کے عہدے میں سے کسی اور کی شراکت گوارا نہیں کر سکتا۔

ماضنین کی سیاست اور صحافت قوم کو پتھر کے زمانے میں سانس لیتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ از منہ ء قدیم میں بار برداری کے لیے مختلف نوع کے جانوروں کا استعمال کثرت سے ہو رہا ہے۔ ماضنین میں یہی کام اشرف المخلوقات سے لیا جاتا ہے جنہیں ناول نگار نے فینٹسی انداز میں دو ٹنگی کہا ہے۔ ان کے متعلق ناول نویس کا بیان ہے:

> ''اچانک مجھے ایک اور خیال سوجھا۔ دو ٹنگی بن کر کچھ کمایا جا سکتا ہے۔ دو ٹنگیاں شترابا کی ٹرانسپورٹ نمبر ا ہیں۔ وہ معزز آدمیوں اور آسمان کو چھونے والوں میں رہنے والوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر گھنٹے کے حساب سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ سڑک کے پرلی طرف کئی دو ٹنگیوں والے سواریوں کے انتظار میں ٹھہرے تھے۔''[۲۹]

خالد اختر کا تعلق جنوبی پنجاب سے تھا انہوں نے یہاں کے کچھ شہروں بالخصوص بہاول پور، میاں والی اور ملتان کے کچھ علاقوں میں سائیکل رکشے دیکھے جو ٹانگوں سے چلتے تھے۔ اسی طرح ان کا سسرالی شہر ڈیرہ اسماعیل خان ہے۔ وہاں بھی وہ غریب طبقہ کو وہ اس ہزیمت سے دوچار ہوتا ہوا دیکھ چکے تھے۔ یہ دو ٹنگی کا تصور انہوں نے انہی علاقوں سے لیا۔ ویسے بھی ناول کے تخلیقی سال ۱۹۵۰ء سے سال رواں تک اگر معاشی اعداد و

شمار سامنے رکھے جائیں تو تلخ حقائق یہ بتاتے ہیں کہ غربت اور بے روزگاری میں تسلسل اور تیزی سے اضافہ ہوا جس کے سبب ذرائع آمد و رفت بھی متاثر ہوئے ہیں۔ دور حاضر میں تو پاکستان انٹر نیشنل ایئر لائن اور ریلوے کی تباہ کاری کے بعد ہم اس شعبہ میں مزید زوال کی جانب رواں دواں ہیں۔ اگر تنزلی کا یہ سفر یوں ہی جاری رہا تو مستقبل میں ہ میں اپنے ملک میں دو ٹنگی ہی نظر آئے۔ پھر محمد خالد اختر کی یہ بات بھی حقیقت میں بدل جائے گی اور فینٹسی نہیں رہے گی۔ اسی تصور کو جب وہ سوچتے اور اس کی کچھ جھلکیاں اپنے گرد و پیش میں دیکھتے ہیں تو ایک حساس تخلیق کار کے طور پر اسے بھی بیس سو گیارہ میں شدید طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''یہ تمہارے لیے اب بغیر جوتے کی زندگی کا آغاز کرنے کا نادر موقع ہے اور اگر تم چاہو تو ایک بے فائدہ اور پر تکلف رواج سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ کوئی دوسرے حیوان جوتوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی بہت سی دوسری فروعات کی، اور میں نہیں سمجھتا کہ انسان جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے اگرچہ دوسرے حیوانات کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ اس سے سخت اختلاف کریں) اور یقیناً (میں اقرار کرتا ہوں) سب حیوانوں سے بڑھ کر حیوان ہے، اپنی زندگی کو خوش گوار گزارنے کے لیے اتنی لاتعداد ڈینی ٹیز کا محتاج ہو۔'' [۳۰]

پاکستان کا قیام ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ نوزائیدہ ملک کو آئین و قانون کی ضرورت تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے میں زیادہ عرصہ لگا۔ اس تاخیر کا باعث جہاں ارباب اقتدار کی سہل پسندی تھی وہیں آمریت نے بھی اپنا کام دکھایا۔ آمروں کا بار بار اقتدار پر قبضہ اور ارباب سیاست کی نااہلی سے اس اہم فریضہ کو التوا میں ڈالنے پر خالد اختر نے یوں طنز کی ہے:

> ''ساٹھ سال پہلے جب افضل تر کابو اعظم نے اس مملکت کی داغ بیل ڈالی تو ماضنیوں نے ضرورت محسوس کی کہ ان کی ایک کانسٹی ٹیوشن ہونی چاہیے، چناں چہ ملک کے لیڈر دستور سازی پر کمر کس کے تیار ہو گئے۔ اس وقت ان کا خیال تھا کہ کم از کم پچاس سال میں وہ اس

اہم کام کو سرانجام دے سکیں گے، اگرچہ یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ دستور پچاس سال میں کبھی تیار ہو سکتے ہیں اس کام کے لیے تو صدیوں اور قرنوں کا عرصہ چاہیے۔''[۳۱]

''ماضنین میں عوام کو احتجاج کی کھلی اجازت تھی۔ جب مجمع اپنے حقوق کے لیے اکٹھا ہو جاتا اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو کے حکمران طبقہ کے سامنے صدائے احتجاج بلند کرتا تو زمام اقتدار کے مالک کا انہیں بانی ماضنین سے منسوب کوئی نہ کوئی جھوٹا قول سناتے، اس قول میں ہمیشہ حکمرانوں کی سلامتی اور فلاح پوشیدہ ہوتی۔ اسے سنتے ہی عوام احتجاج ترک کر دیتے۔ قوم کی یہ سادہ دلی ظالم اور بے رحم حکمرانوں کے لیے عافیت کا سبب بنتی۔ اس کی مثال ۱۹۶۰ء میں کھلی ہوا کے عاشقوں کی شورش سے دی جا سکتی ہے۔ جب ان کا مجمع ''ہمیں روٹی دو!'' کا نعرہ لگاتا ہوا اس وقت کے وزیر اعظم کے مکان پر پہنچا تو اس مدبر نے اپنے مکان کے دروازے کے ستون پر چڑھ کر مجمعے کو شرم دلائی کہ وہ روٹی مانگ کر افضل ترکابو کے بھوت کو دکھ پہنچا رہے ہیں اور ان کو اس ننگ اور بھوک کی میراث پر قانع بلکہ نازاں ہونا چاہیے اور اس وقت جب کہ مملکت اتنے نازک دور سے گزر رہی ہے ایسے تقاضوں سے لیڈروں کی محنت سے حاصل ہوئی اور کمائی ہوئی نیندوں میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔ چناں چہ مجمع ''افضل ترکابو زندہ باد!، وزیر اعظم زندہ باد!'' کے نعرے لگاتا ہوا منتشر ہو گیا تھا۔''[۳۲]

درج بالا اقتباس ماضنین کے زیرک ارباب اقتدار کا طرز حکمرانی ظاہر کرتا ہے۔ جب حکمران طبقہ اس قدر مدبر ہو تو پھر ملک کا ہر شعبہ نورٌ علیٰ نور ہوتا ہے۔ ماضنین کے مستقبل کے قانون کے کچھ نکات تو سامنے لائے گئے جن میں ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ ملک کے تمام افراد کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے لیکن ایک دوسرے رکن کی رو سے گو سب آدمی برابر ہیں، چند چنیدہ لوگ دوسروں سے زیادہ برابر ہیں:

''یہ چنیدہ لوگ قدرتاً نازک طبع واقع ہوئے ہیں اور ذرا سی چوٹ برداشت نہیں کر سکتے۔ مملکت کے وہ لوگ جو ان کا دل دکھاتے ہیں فوراً حکومت کو پیارے ہو جاتے ہیں اور خاص مہمان خانوں میں مستقل طور پر رہائش پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کردار، گفتار وغیرہ کی مکمل آزادی جس قدر ماضنین میں ہے شاید دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ اگر تمہارا گھر نہیں تو

تم کھلی ہوا میں رہنے والوں میں شامل ہو کر سڑک کے عین وسط میں رہ سکتے ہو۔ اگر روٹی نہیں ملتی تو سڑک کے کنارے کوڑے کرکٹ میں سے جھوٹی غلاظت کھا سکنے کی آزادی تمہاری ہے۔ مگر سب سے بڑی آزادی فاقے سے مرنے کی آزادی ہے۔'' [۳۳]

کھلی فضا کے عاشقوں سے مراد وہ بے بس، مجبور اور لاچار ہیں جنہیں رہنے کو چھت، پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی کے چند ٹکڑے بھی میسر نہیں۔ ماضنین میں مصنف نے ایسی بے چارگی کا شکار عوام کی تعداد لاکھوں میں بتائی ہے اور شدید طنز کے انداز میں کہا ہے:

''وہ کھلی فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ شہر کی سڑکیں، چوراہے، پل، ان کے اپنے ہیں۔ کھلی ہوا سے ان کی محبت قابل تعریف ہے۔ جب وہ بارش اور سردی میں بھی وہیں پڑے رہتے ہیں تو میرے خیال میں یہ قدرت کی چیزوں سے محبت کے جذبے کو زیادہ دور لے جاتا ہے۔ کئی ان میں سے نیوڈسٹ اور نیچر لسٹ ہیں۔'' [۳۴]

عہد حاضر میں ہمارے شہروں میں مذکورہ بالا صورت حال تقریباً ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ عوام کی خاطر جینے مرنے کے دعوے کرنے والے سیاست دان اور مقتدر طبقات اس ساری صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ ان بے گھر اور بے اثر لوگوں کے لیے اگر کوئی سبیل نہ نکالی تو یہ اکیسویں صدی کی نام نہاد مہذب دنیا کے ماتھے پر بد نما داغ مزید پختہ ہوتا چلا جائے گا۔ اگر ہم اپنے ہی ملک کو مد نظر رکھیں تو کراچی، لاہور، اسلام آباد، ملتان اور راول پنڈی جیسے بڑے شہروں میں ہ میں بچے، بوڑھے، مرد اور زن سڑک کے کناروں اور پلوں کے نیچے سوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس گھمبیر صورت حال سے عوام کو نکالنے کے لیے تمام ذمہ داروں کو اپنی غلطی تسلیم کر کے حقیقت کا ادراک کرنا ہوگا۔ ایسی محرومیوں سے ہی بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں جنہیں بعد میں سنبھالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ماضنینی وزراء کے علاوہ خالد اختر نے بیس سو گیارہ میں مختلف اقوام کی تہذیب و تمدن پر بھی بصیرت افروز تبصرے کیے ہیں۔ ان تبصروں کی بدولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول مصنف کے تہذیبی شعور کا بھی عکاس

ہے۔ محمد خالد اختر نے بیس سو گیارہ میں تہذیب و ثقافت کے متعلق جو بیش قیمت تجزیے کیے ہیں وہ ان اقوام کے نفسیاتی اور سماجی رویوں کے عکاس ہیں۔ امریکہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''امریکہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شارح اور سب سے اہم معمار تھا۔۔۔ امریکہ کے پاس اس وقت گویا تہذیب کی اجارہ داری تھی۔ بہر حال امریکی کلچر یا امریکی تمدن اتنے بڑے پیمانے پر ہالی وڈ کی فلموں، ان گنت میگزینوں اور کوکا کولا کی شکل میں دنیا کے ہر غیر مہذب ملک کو برآمد کیا جانے لگا تھا۔ بہت سے لوگوں کے تحت الشعور میں میں تہذیب اور ''امریکیانا'' ایک ہی چیز کے دو نام ہو گئے۔۔۔ لیکن یہ امریکیانا وہ بلند تر امریکی کلچر نہیں۔ وہ آئن سٹائن کی حیرت انگیز دریافتیں نہیں جو اس نے اپنے امریکہ میں قیام کے دوران کیں، وہ امریکی مصنفوں اور فلسفیوں کی پرواز نہیں۔ یہ امریکیانا کچھ فحش، کچھ متلی لانے والا ہے۔ امریکی تہذیب کا سب سے لچر، سب سے پوچ بیرونی خول۔''[۳۵]

دورِ حاضر کا امریکہ ایک بڑی طاقت ہونے کے ناطے غریب اور پس ماندہ ممالک میں فسادات کا ذمہ دار ہے۔ چھوٹے ممالک میں تہذیبی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی بگاڑ کا ذمہ دار ہے۔ ایک بڑی اور مضبوط ریاست کے ہوتے ہوئے علم کا فروغ اس کی ذمہ داری بنتی ہے لیکن اس نے منفی تفاعل پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اس دور کی تاریخی فینٹسی آج حقیقت نظر آ رہی ہے۔

امریکہ کے بعد خالد اختر نے اپنی فینٹسی میں انگلستان کی تہذیب و تمدن پر بات کی تھی۔ انہوں نے امریکیوں سے پرانی تہذیب برطانیہ کو قرار دیا۔ مصنف کے نزدیک انگلستان کے لوگ امریکیوں سے زیادہ ٹھوس صفات کے حامل تھے۔ انسب کے دنیا بھر میں عمدہ ترین ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ مگر امریکیوں کی طرح انہوں نے کبھی شیخی نہ بگھاری۔ انہوں نے اپنا کلچر پھیری پر رکھ کر بیچنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ برطانوی کلچر مصنف کے خیال میں بہت سی صفات کا مجموعہ ہے لیکن وہ فرانسیسیوں کی ثقافت اور اخلاق، ان کے آرٹ اور ادب کو دنیا بھر میں بے مثال سمجھتے ہیں۔ مصنف کے خیال میں اہل فرانس کی تاریخ بہادری اور حوصلے کے

کارناموں سے پر رنگ اور درخشاں تھی۔ انہوں نے حسن اور عورت کی پرستش کو ایک کلٹ بنالیا اور عورتوں سے محبت کرنا جانتے تھے۔ انہی بنیادوں پر وہ دنیا کی سب سے مہذب قوم تھے۔[۳۶]

سفید فام کے بعد محمد خالد اختر سیاہ فام افریقیوں کی تہذیب و تمدن پر رائے زنی کرتے ہیں۔ انہیں افریقی اقوام قدامت پسند اور ماضی سے محبت کرنے والی لگتی ہیں۔ ماضی پرستی میں یہ اقوام اس قدر انتہاء کو پہنچتی ہیں کہ ان کے حکمران بھی عہد رفتہ کی یادگار نظر آتے ہیں۔ ناول نویس کے مطابق افریقہ پر پھر ایک مطلق العنان فرعون کا راج ہے جو قدیم مصری تہذیب کو پھر زندہ کرنے پر آمادہ ہے۔ لوگ وہاں کے سچے دین سے منحرف ہو کر پھر اپنے آباؤاجداد کے قدیمی پھن دار سانپ کی پرستش کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ قدیم مصری تہذیب کے مطالعہ سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ مصریوں کے یہاں ناگ کی کتنی اہمیت تھی۔ فراعین مصر تاج پر ناگ کی شبیہ کا مکٹ پہنتے تھے۔[۳۷] مصریوں کی دیومالا میں بھی دیگر جانوروں بیل، مینڈھا، گائے، مگرمچھ، بلی، سانپ، گیدڑ، بندر، عقاب، چیل وغیرہ کے ساتھ ساتھ سانپ بھی شامل تھا اور مقدس تصور کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے حصے بنائے جاتے تھے اور انہیں جان سے مارنے کی سزا موت تھی۔[۳۸] مصریوں کی دیومالا کا تعلق بھی حقیقت سے دور اور فینٹسی ہے۔

محمد خالد اختر بیس سو گیارہ میں نسل پرستی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ افریقی سفید اور سیاہ فام کا ذکر کرتے ہوئے وہ واضح طور پر سیاہ فام کو غالب اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناول کی رو سے تیسری عالمی جنگ کی ہولناکی سے جو ملک بچ گئے ہیں ان میں ایک ریاست ہائے متحدہ افریقہ ہے۔ خالد اختر کے مطابق:

> ''اس ملک میں سیاہ آدمی نے اپنے آپ کو پوری طرح اسرٹ کر لیا ہے اور سفید آدمی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ ان کا مستقبل شاندار ہے کیوں کہ ان میں اپنی قدیم نسل کا بدراہ جینیئس ہے اور کسی دن وہ دنیا کو اس کا بہترین ادب، اس کی سب عظیم موسیقی دیں گے۔''[۳۹]

محمد خالد اختر نے تاریخی فینٹسی کے ذریعے افریقہ کے سیاہ فام افراد کی آزادی کا جو خیال پیش نظر ناول میں پیش کیا ہے وہ آج ایک حقیقت بن گیا ہے۔

نیلسن منڈیلا کی قیادت میں اپنے حقوق اور آزادی کے لیے جہد مسلسل کرنے والی اس قوم نے بالآخر سفید فام جبر اور زنجیر کو ختم کر ڈالا۔ ناول میں جہاں تک ان کی طرف سے فنون لطیفہ میں کامرانیوں کی بات ہے ابھی تک اس میں وہ مقام حاصل نہیں ہو پایا۔ اس کا تعلق دور حاضر میں فینٹسی سے ہی نظر آرہا ہے۔

تاریخی یا زمانی فینٹسی کے علاوہ پیش نظر ناول سائنس فینٹسی عناصر کا حامل بھی ہے۔ سائنس فینٹسی کی اصطلاح تو اردو ادب میں مغربی تنقید کے راستے سے داخل ہوتی ہے۔ لیکن اس کی موجودگی کے اولین نقوش مشرقی داستانیں اور قصے کہانیاں ہیں۔ اردو ادب کی اہم داستان طلسم ہوش ربا کو سائنس فینٹسی کی عمدہ اور کلاسک نظیر کہا جا سکتا ہے۔ سائنس فینٹسی سائنس فکشن کے بہت قریب ہے، تاہم ہر وہ فن پارہ جو سائنس فکشن ہو اسے سائنس فینٹسی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ سائنس فکشن حقیقت کے قریب ہوتا ہے جب کہ سائنس فینٹسی کا تعلق مافوق الفطرت اور خارق العادات کرداروں اور باتوں سے ہے۔

سائنس فینٹسی کے عناصر افسانوی ادب کی تمام اصناف میں سما سکتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کو مد نظر رکھا جائے تو اس کا نقش اول میں داستان سے ملتا ہے۔ اردو داستان اور مغربی ناول کے اثرات سے یہ عناصر میں ناول اور افسانے میں نفوذ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو ناول میں سائنس فینٹسی کی ابتدائی جھلکیاں محمد خالد اختر کے پہلے ناول بیس سو گیارہ میں نظر آتی ہیں:

> ''اردو ناول میں سائنس فینٹسی کا نقطہ آغاز بیس سو گیارہ ہے۔ اگرچہ سائنس فینٹسی یہاں زیادہ مقدار میں نہیں ہے۔ مصنف نے ماضنین میں ایک ایسی سائنس لیبارٹری کا انکشاف کیا ہے جس میں نائٹروجن بم بنائے جاتے ہیں۔ لیبارٹری کے مالک کی ترغیب بے اندازہ ہو گی اور یہ کوئی زیادہ حیرت میں ڈالنے والی بات بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ تقریباً ہر آدمی اذیت پسند ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر بھی ایک ماگلووچ ہے۔'' [۴۰]

یہاں دیکھا جائے تو ماگلووچ ظلم و جبر کی علامت ہے جسے محمد خالد اختر نے فینٹسی انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کی آماج گاہ ہر ظالم کا سفاکانہ دل ہے۔ یہاں مصنف نے انسانی سرشت کی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے جس کی تحریک کے سبب ہی کوئی آدمی دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے۔ان سے جینے کا حق چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔اسے اپنے ہی ہم جنس بھیڑ بکریوں کا ریوڑ نظر آتے ہیں۔

یہ ماگلووچ روس کے چند احمق سائنس دانوں جو کہ اس وقت اس ملک کے حکمران بھی تھے ان کا سپر سائنٹسٹ تھا۔ ماگلووچ کے ساتھ مل کر ان دیوانے حاکموں نے دنیا کو تباہ کرنے کے بعد اپنے ملک کی تباہی کی طرف توجہ دی۔ ماگلووچ نے ہائپر بوئروں کے جزائر سے ایسے خون خوار کتے منگوائے جو روسی ایوان نمائندگان کا خون پی کر اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ان کتوں کو ماگلووچ اپنی محافظ روحیں قرار دیتا تھا۔ جب خداوندان سائنس اس قدر سڑی دماغ ہوں تو پھر یہ علم انسانیت کی خدمت نہیں کر سکتا بلکہ اس کے مصائب میں اضافہ کا سبب ہو سکتا ہے۔

ان خوف ناک اثرات سے علم سائنس کے محافظ ایسے بھیانک ہتھیار ایجاد کرتے ہیں جو لاکھوں انسانوں کو چشم زدن میں ہلاک کرنے کا سامان کر سکتے ہیں۔ان خوف ناک بموں کی تاب کاری کا بھی محمد خالد اختر نے ذکر کیا ہے۔ یہ تابکاری زمین کے اندر بھی دو ہزار فٹ تک اپنے زہریلے اثرات پہنچانے میں کامیاب رہی تھی۔ جہاں یہ بم گرائے گئے ان علاقوں کے عوام کے متعلق ناول نویس کی رائے ہے کہ تاب کاری کے اثرات ان کے جسموں میں سرائیت کر گئے اور بعد میں ان کے مرکز حیات کو جلانے میں کام آئے۔ ناول کی تخلیق سے چند سال قبل ہی انسان نے ان خوف ناک ہتھیاروں کی ایجاد کا مزا چکھا تھا جو تاریخ کے کسی بھی موڑ پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

نائٹروجن بم کے بعد محمد خالد اختر نے راکٹ ٹیکنالوجی پر بات کی ہے۔ اگرچہ اس نوع کا راکٹ ہنوز ایجاد نہیں ہوا اور ناول میں ان کی موجودگی سائنس فینٹسی ہے۔ یہاں مذکور راکٹ ہزاروں میل کا سفر چند ساعتوں میں کر لیتا ہے۔ راکٹ کی خدمات ماضنین کے اندر آنے والوں اور باہر جانے والوں کے لیے یکساں میسر

ہیں۔ ماضنین کے یہ راکٹ چلتے وقت لٹو کی طرح گھومتے ہیں۔ مسافروں کو ماضنین کے دارالحکومت شترابا کے اڈے میں وصول کرنے والے آلے میں بھیج دیتے ہیں۔

محمد خالد اختر نے سائنس کی مثبت تخلیقات اور ایجادات کا جو ذکر کیا ہے اگر ان پر توجہ کی جائے تو انسان کی بہت سی پریشانیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کارپردازان سائنس پر جو اس عظیم اور انسانیت کے لیے نافع علم کو بھیاآودہ کر کے انسانیت کے مسائل میں بے تحاشا اضافہ کر رہے ہیں۔ اگر سائنس و ٹیکنالوجی میں مہارت رکھنے والے ممالک اور افراد نے اپنی ذمہ داریوں کو نا سمجھا تو یہ نہ صرف ابن آدم بلکہ باقی مخلوقات کے لیے بھی اندوہ ناک ثابت ہوگا۔

بیس سو گیارہ محمد خالد اختر کا انسانیت سے متعلق وہ خواب ہے جس کے اکثر مناظر الم انگیز اور کرب ناک ہیں۔ جہاں انہیں انسان کا مستقبل غیر محفوظ اور اہم تہذیبوں کے معدوم ہونے کا خدشہ لاحق ہے۔ وہیں وہ تصوراتی طور پر اسے اپنے ملک کے تمام شعبے کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ارباب اختیار یا نام نہاد جمہوریت کے ثمر بردار ان تلخ حقائق سے اتفاق نہ کریں لیکن ناول نویس نے جس انداز میں ملکی اور عالمی سیاست، معاشرت، تہذیب اور اخلاقی حالت کی تصویر کشی کی ہے وہ اس میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ ناول میں بیان کی گئی بہت سی باتیں آج سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان کا تدارک آج کی مہذب کہلانے والی دنیا کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ناول نویس دراصل ہماری ملکی اور بیرونی ہر سطح پر انسان کو محفوظ اور خوش حال دیکھنے کا متمنی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس بابت اعلان کرتے ہیں کہ :

> ''ہر فنتاسی کے پیچھے جو اخلاقی مقصد پنہاں ہوتا ہے وہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔'' [۴۱]

حوالہ جات

۱۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ (کراچی: آج کتب خانہ، پیپر بیک سیریز، ۱۹۹۹ء)، ص ۸۔

۲۔ ایضاً، ۱۰۔

۳۔ اشفاق احمد ورک، علی محمد خان، اصناف نظم و نثر (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۲۷۔

۴۔ ڈاکٹر ممتاز عمر،نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۴ء)، ص ۴۷۔

۵۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی، عبدالحلیم شرر به حیثیت ناول نگار(کراچی : انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۷ء)، ص ۱۷۳۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔

۷۔ شمس الرحمان فاروقی،شعریات(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۳۔

۸۔ محمد خالد اختر،بیس سو گیارہ، ص ۱۳۔

۹۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔

۱۶۔ اشفاق احمد ورک، محمد خالد اختر: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء)، ص ۵۰۔

۱۷۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ، ص ۶۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ،خطوط :شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۱۶۔

۲۳۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ، ص ۲۲۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۲۵۔ ایضاً، ص۶۶۔

۲۶۔ ایضاً، ص۷۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص۷۳۔

۲۸۔ ایضاً، ص۴۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص۸۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص۱۰۴۔

۳۱۔ ایضاً، ص۳۸۔

۳۲۔ ایضاً، ص۳۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۹۔

۳۴۔ ایضاً، ص۴۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص۱۳۔

۳۶۔ ایضاً، ص۶۱۔

۳۷۔ علی عباس جلال پوری، رسوم اقوام(لاہور: تخلیقات،۲۰۱۳ء)، ص۸۹۔

۳۸۔ علی عباس جلال پوری، روایات تمدن قدیم(لاہور: تخلیقات،۲۰۱۲ء)، ص۴۳۔

۳۹۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ، ص۲۱۔

۴۰۔ ایضاً، ص۱۹۔

۴۱۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، اردو ناول کے چند اہم زاویے (اضافوں کے ساتھ)(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۲ء)، ص۳۱۶۔